

الکتاب — سینیویہ کا ایک عظیم کارنامہ

توقیر عالم فلاحی، ریسرچ اسکالرشپ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ عربی زبان و ادب کے سرمایہ میں جو قابل ذکر
اضافہ عہد عباسی میں ہوا ہے اس کے مقابلے میں نہ تو پہلے یوں اور نہ اس کے بعد چنانچہ
یہ دور اسلام کا وہ زریں دور ہے جس میں مسلمان تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بام
عروج پہنچ گئے اور انھوں نے تاریخ اسلامی کے ایوان کو کچلے وثقاقت اور علو
دفعوں کے لحاظ سے درخشاں اور تابندہ بنا دیا۔

عروج و اقبال کے اس تابناک دور میں فتوحات کا سلسلہ بھی سیل رواں کا
طرح بڑھ رہا تھا، ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ حکومت کی توسیع و استحکام
کے لیے غیر عربوں کو عربی معاشرے میں ضم کر لیا جائے اور ان کے اندر سے احسان
کہتری، مرغوبیت اور اجنبیت ختم ہو تاکہ مفتوحہ ممالک کے یہ غیر عرب لوگ
عربوں کے شانہ بشانہ ہو کر عالم انسانیت کے قابل ذکر حصوں پر فخر و تسخیر
کنندہ بن سکیں۔ یہی وہ غایت تھی جس کے حصول نے عربوں کو ہمیز کیا کہ گو
ایسا فن و جد میں آئے جو زبان کی تعلیم و تعلیم میں معاون و مددگار ہو سکے
چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی میں اس سمت میں عملی طور پر پیش قدمی ہوئی اور
بنی گرامر کے دو مکتبہ فکر و جد میں آئے۔ جنھوں نے بلا شک و تردید بلا
عربی کی بقا و تحفظ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے اہم نمائندوں
میں خلیل ابن احمد، ابو جلیدہ بصری، المثنیٰ، الاخفش، الاصمعی، الزجاج، کسا
نیرامہ، ابوزکریا، المفصل الدلی اور ابن الانباری کا شمار ہوتا ہے۔

سیبویہ - میدان نحو کا شہسوار :

ان مکاتیب فکر کے ناموران نحو میں سیبویہ کا مقام بڑا ہی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ خود اس وقت کا مشہور محاصر ادیب اور نحوی اس کی ذات سے اس قدر متاثر نظر آتا ہے کہ اس کی بلا کی ذہانت اور استعداد و صلاحیت نے اسے اس اعتراف حقیقت سے باز نہیں رکھا کہ نحو میں لوگوں نے اس جیسی کتاب نہیں لکھی۔ متقدمین اور متاخرین تمام کی نحوی کاوشوں پر الکتاب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ سیبویہ متقدمین اور متاخرین دونوں سے نحو کے معاملے میں سبقت لے گیا۔ ابو الطیب عبد الواحد اس کے علمی مقام کا تذکرہ اسی ایک جملے میں کرتے ہیں۔ ”وہو اعلم الناس بالنحو بعد الخلیل“۔

شروع میں وہ حدیث و فقہ کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اسی سلسلے کی مشغولیت میں حماد بن سلمہ کے یہاں حاضر تھا اور اس کی املا کرائی ہوئی ایک حدیث رسول لکھ رہا تھا جس کی عبارت یہ تھی ”لیس احد من اصحابی الا و طرا خذ علیہ لیس ابوالدائمہ عر“۔ سیبویہ بول پڑا ”لیس ابوالدائمہ داء“ ہونا چاہیے تو اس پر حماد نے کہا کہ دیکھو سیبویہ تم غلطی کر رہے ہو ”لیس ابوالدائمہ ہی صحیح ہے۔ استاد کی اس تلقین کا سیبویہ کی علمی زندگی پر بڑا اثر پڑا اور اس نے یہ عہد کر لیا کہ وہ ان قواعد و ضوابط کو سیکھے گا جن کی مدد سے غلطیاں درست ہو جائیں گی۔ واقعہ نحوی علم کی تحصیل میں سرگرم عمل ہونے کا محرک خاص بنا اور بصری مکتبہ فکر کے اہم ترین نمائندہ خلیل بن احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مزید برآں یونس اور عیسیٰ بن عمر جیسے قابل نحویوں سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنے لشکوں علمی کو بھرنے میں پیش پیش رہا۔

چونکہ خلیل بن احمد دیستان بصرہ کے ایک نامور استاد اور اس دیستان کے

رکنِ رزمین تھے اس لیے علمِ نحو کے شائقین موصوف کے پاس رہے اور بحیثیت تلامذہ رفاقت اختیار کرنے کو باعثِ اعزاز و افتخار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار علم کے پیاسوں نے علم و فکر کے اس اچلتے ہوئے چشمے سے سیرابی حاصل کی۔ نصر بن تمیم، علی بن نصر الکھضی اور مورج السدوسی کا شمار وقت کے ان ممتاز علماء لغت و نحو میں ہوتا ہے جنہوں نے عربی زبان و ادب پر بڑا احسان کیا ہے لیکن ان تمام میں ممتاز اور نمایاں سیبویہ تھا جو میدانِ نحو کا عظیم شہسوار ثابت ہوا۔

یہ بات ذہن نشیں

ہونی چاہیے کہ عرب علماء قابلِ قدر و احترام انھیں تصنیفی کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے
عربی عمر پائی ہو۔ سیبویہ کے فضل و کمال اور خداقت و ہجرت کا اندازہ لگانے کے لیے
یہی سند کافی ہے کہ کم عمر پانے کے باوجود اس کی تصنیف شرفِ قبولیت سے ہمکنار
ہوئی۔ اس نے علومِ عربیہ میں وسعتِ مطالعہ کا بخور ایک ایسی تصنیف میں پیش
کیا ہے جو قدیم تذکرہ نویسوں کے بقول ایک ہزار اوراق پر مشتمل ہے اور یہ بات
بھی قابلِ ذکر ہے کہ دبستانِ بصرہ کی جو علمی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اُسے ہمیشہ
عربی نحو کے مطالعے میں بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ اس کتاب کا نام بذات خود سیبویہ تے نہیں رکھا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سیبویہ نے اپنے منظم ارادے کے تحت اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا ہو اور اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔ علی نجدی نے بھی اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تزئین و آرائش سے متعلق دوسرے مباحث کا نقشہ ذہن میں رہا ہو گا اور اس نے یہ سوچا ہو گا کہ اس سے فراغت کے بعد ہی نام رکھا جائے گا۔ بس اس کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے کسی کو پڑھ کر

ستایا نہیں اور نہ ہی اس کے سامنے کسی نے پڑھا۔ کچھ

بہر حال اس کی موت کے بعد ہی علماء کے اتفاق رائے سے اس کتاب کا
”کتاب“ رکھا گیا اور اس کے ساتھ کوئی صفت یا اضافت نہیں تھی۔ پھر بعد میں بیٹنا
علماء ”الکتاب“ کے نام سے معروف ہو گئی تاکہ دوسری کتابوں میں اور سیبویہ کی اس
کتاب میں فرق و امتیاز ردوارکھا جاسکے۔ یہ اس کتاب کے اندر نہ ہی مقدمہ ہے نہ
خاتمہ۔ یہاں تک کہ ترتیب وغیرہ کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز کلمہ کی جگہ
سے ہوا ہے اور اختتام ”علماء بنو فلان“ نامی باب پر ہے مقدمہ، خاتمہ اور ترتیب
ہونے کے باوجود عربوں نے ہمیشہ اسے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا ہے
کہ صاحب ”الکامل“ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ علم میں کوئی کتاب جو اس کے مثل ہو
اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دوسرے علوم کی تمام کتابیں
دوسری کتابوں کی محتاج ہوتی ہیں اور سیبویہ کی کتاب دوسری تمام کتابوں سے جینا
جے نلجے۔ علی نجدی اس کتاب کا تعارف ان عبارتوں میں کر لیتے ہیں۔ کات کتاب سیبویہ
فی النحوی کان ہو و حدہ الحقیق فی - ایہم ان سیمی بالکتاب اما غیرہ
فلا ینبغی ان سیمی بہ الا علی ضرب من التجوز و الامحاملۃ۔

ترجمہ: لوگوں کے خیال میں سیبویہ کی کتاب ہی حقیقی معنوں میں نحو کی کتاب ہے جو الکتاب
سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی کتاب کو الکتاب کے نام سے موسوم نہیں کیا
جانا چاہیے۔

الکتاب ہی صرف نحو کی کتاب ہے دراصل ایسا نہیں ہے۔ ہاں اس کے حق و
وسعت اور نحو کے باب میں ہمہ گیریت کو پیش نظر رکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس فن میں
اس کے مثل کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ وسعت معلومات کے لیے ہر شخص مجبور ہے کہ
وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے۔ یہاں ہم اس کتاب کے مقام و مرتبہ سے متعلق کوئی

تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ آگے چل کر موقع آئے گا کہ علماء اعظام اور خود
 مہجور کے ہمسرا تہیوں کے بیانات کی روشنی میں اس کتاب کی وقعت واضح کی جا
 ئے تو اس کتاب کا ایک مختصر تعارف مقصود ہے کہ دراصل یہ کتاب وہی ہے جو سیبویہ کی
 فائز کے وفات کے بعد اس کے استاد الاخفش کے ذریعہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن کی
 شکل میں منظر عام پر آئی اور الکتاب کے پروکار نام سے معروف ہوئی۔ اس کتاب
 بہتر ابواب ہیں اور ہر باب ذیلی عناوین کے ذریعہ اس طرح شرح و بسط کے
 ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ طالب العلم آگے بغیر خوبی ذوق تجسس کی پیاس کو
 بجاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور علم کے اس دریا میں غوطہ زنی کرتے ہوئے گوہر
 بہار حاصل کر لیتا ہے۔

خصوصیات - ایک نظر میں

اس شاہکار تصنیف کی متعدد خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ کتاب پورے
 مشرق و مغرب میں شہرت و احترام کی شاہراہ پر آکھڑی ہوئی۔ یہاں چند خوبیوں کا
 ذکر ہر ناگزیر معلوم ہوتا ہے تاکہ مخاطب یا قاری اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکے۔
 ۱:- سیبویہ اس امر کو قابل ترجیح سمجھتا ہے کہ اس کی گفتگو تفصیلی ہو۔ یہی وجہ ہے
 کہ وہ ہر باب کی ہر شق پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے۔ اس کے مباحث، مربوط ہوتے
 ہیں، ان کے اندر کسی طرح کا اضطراب نہیں پایا جاتا۔ فقرے اس حد تک ایک
 دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں گویا کہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں ان خوبیوں
 کی بنا پر سامع یا قاری کے سامنے کوئی گوشہ تشنہ تو ضیع نہیں رہتا اور پھر دوسرے
 سینے پر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔

۲:- کہیں وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ قاری خاتمہ باب تک پہنچ جائے
 کسی نئے باب کو موضوع بحث بنانے کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

و اعلم ان الامر کذا او کذا۔ کہہ کر صاحب کتاب باخبر اور ہوشیار کرنا چاہتا ہے کہ گفتگو کے نئے مرحلے سے سابقہ پیش آرہا ہے۔

۳:- اس کی عبارتوں میں اس لحاظ سے تغذات ہے کہ کہیں وہ صبح درختوں کے مثل بیٹھے اور واضح ہیں اور کہیں وہ طلسماتی بن کر رہ جاتی ہیں جہاں عقل حیران ہو جاتی ہے اور قاری عاجز و درماندہ رہ جاتا ہے۔

۴:- بہترے الفاظ ایسے ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے دوسرے توضیحی الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میرزا کا شاگرد رشید ابن کیسان کہتا ہے۔ سیبویہ کی کتاب پر غور و خوض کے بعد پاک کر و دشایان شان مقام پر ہے۔ نیز اس کے الفاظ دوسرے الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ کتاب اس وقت منظر عام پر آئی ہے جبکہ تصنیف و تالیف کے میدان میں الفاظ کے استعمال کا یہی طریقہ مروج تھا۔ سیبویہ نے کبھی دوسروں کا خیال کر کے اپنی تالیف میں یہ بہج اختیار کیا۔

مذکورہ بالا چوتھی اور پانچویں باتیں بظاہر کسی بھی کتاب کی قدر و قیمت کے خلاف نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز تصنیف و تالیف کے نقص پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی کسی عیب یا خامی کی نشاندہی پر۔ بلکہ کہیں شرح و بسط اور کہیں ایجاز و اختصار سے کام لینا، کہیں غموض و ابہام اور کہیں وضاحت و تبیین کا طریقہ اختیار کرنا، مؤثر اور دلنشین پیرایہ بیان کا ایک تقاضا ہے۔

ابن قتیبہ مختلف اسالیب بیان میں قرآن کے خطاب کرنے کو اس کی عظمت کی دلیل مانتے ہیں اور عرب خطیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب کا خطیب جب گھر میں یا بازار میں، نکاح کی مجلس میں یا جنگ کے میدان میں تھریں و ترغیب کے لیے یا صلح و مصالحت کی خاطر تقریر کیا کرتا تھا۔ تو وہ ہر موقع پر ایک ہی دادی میں نہیں بھٹکتا تھا بلکہ مواقع کی مناسبت سے مختلف انداز خطاب

اختیار کرتا تھا۔ اگر وہ تخفیف کا ارادہ کرتا تو مختصر کہتا، افہام و تفہیم کا قصد کرتا تو طوالت سے کام لیتا، جب کسی بات کو مؤکد کرتا چاہتا تو تکرار سے کام لیتا، کبھی غرض و ابہام کا سہارا لیتا اور کبھی بالکل ہی کھول کھول کر بیان کر دیتا۔ علی بن سلیمان الاخش کہتے ہیں۔

”حمل سیبویہ کتابیہ علی لغۃ العرب و خطبہا و بلاغہا فصل فیہ بتینا مشرود حاً، وجعل فیہ قسماً، لیکون عن استنبط و نظر فضل و علی هذا خا طبعہم اللہ عن وجل بالقرآن“

ترجمہ سیبویہ نے اپنی کتاب میں مباحث کے افہام و تفہیم کا کام زبان عرب، ان کے خطبوں اور ان کی بلاغت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ کہیں اس نے شرح و بسط سے کام لیا ہے تو کہیں غرض و ابہام سے۔ ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ نتائج استنباط کرنے والوں اور تدبر و تعمق کی نگاہ سے دیکھنے والوں کا فضل و برتری نکلاں جو۔ اور اسی طریقے پر اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں ان کو خطاب کیا۔

چنانچہ ایضاح و ابہام، ایجاز و اختصار اور تقدیم و تاخیر وغیرہ اسی صفات میں جو دوران تالیف و تصنیف مناسب ہی نہیں آتا ہی ناگزیر ضرورت کے طور پر ہیں۔ یہ انداز مصلحت و حکمت کے تحت گھٹو کو دل نشیں بنانے کے لیے کسی بھی مؤلف اور مصنف کا سرمایہ ہے جس کی ضرورت کلام میں زیر و بم، اتار چڑھاؤ اور نصاحت و بلاغت پیدا کرنے کے لیے پڑتی ہے اور اس سے مطالعہ کرنے والوں کو بھی شیرینی کی لذت ملتی ہے۔

بیبویہ۔ الکتاب کے آئینے میں :

کبھی کبھی تصنیف و تالیف کی شہرت و مقبولیت میں جہاں معلومات کی وسعت و موضوعات کے تنوع کا رول ہوتا ہے وہاں دلنشیں پر رائے بیان بھی اپنا نمایاں

مقام رکھتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک ناگزیر ضرورت یہ ہے کہ صاحب تصنیف کے سلسلے میں مطالعہ کے دوران یہ خیال نہ ہو کہ وہ گرفتہ نشیں ہو گیا ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کا یہ احساس ایک طرف تو اس کے نقص پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ عدم موجودگی کا یہ تصور ان پر وہ اثر پیدا نہیں کرتا جو کسی کے ہمہ وقت موجود رہنے کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ سیویہ اپنی اس عجوبہ روزگار تصنیف میں ہر وقت نمایاں رہتا ہے۔ اس کتاب کے اندر سیویہ کی شخصیت کی ترجمانی کن کن پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ یہاں مختصر آں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ وہ ایک لمبھی اپنی کتاب میں گنہام نہیں ہے۔ ڈاکٹر علی نجدی ناصف کے بقول وہ شہد کی مکھی کے مثل نہیں ہے جو مختلف بھولوں، باغوں اور کھینوں کے پھلوں سے رس چوس کر جمع کرتی ہے اور وہ نہیں جانتی کہ ایسا کیوں کرتی ہے ہاں اسے صرف جمع داذخار سے مطلب ہوتا ہے۔

۲۔ فی الحقیقت وہ ہر جگہ مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے حاضر رہتا ہے یہاں تک کہ آثار علماء کی آراء اور قاریوں کی قراءتوں کے ذکر کے وقت بھی رد و فرض نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زری روح موجود ہے اور ایک آواز ہے جو کہہ رہی ہے تاہم یہ مستغفر ہے کہ اس کی شخصیت الہ آثار و آراء کے پشت میں موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں بھی وحشت اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔

۳۔ اپنی کتاب میں وہ لائق اور محبوب استاد نظر آتا ہے۔ ادعاۃ المنار سے احراز کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوتی کہ محض وہ کہتا جائے اور سامعین سنتے چلے جاتیں بلکہ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ زیر بحث موضوع سے متعلق

تمام گوشوں کو واضح اور روشن کر دیے۔ مختلف جہتوں سے وہ اپنی باتیں گائی کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ بلافاصلہ اٹھ کر دہرائے سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ ایک قاری اسے شفیق استاد محسوس کرتا ہے اور ہمہ تن گوش ہو کر اخذ و استفادہ کر کے اپنی جھولیوں کو بھر لیتا ہے۔

۴۔۔ بیاک متکلم اور ناقد کی حیثیت سے بھی اس کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ کہیں پر بھی پس و پیش اور شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ افہام و تفہیم میں تصنع اور تکلف کا لبادہ زیب تن نہیں کرتا ہے بلکہ انتہائی دیاننداری کے ساتھ اور حقیقت بینی کو اپنا شیوہ و شعار بناتے ہوئے مسائل کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور کسی سے متاثر ہوئے بغیر نقد و تنقید کا بیڑا اٹھاتا ہے مثلاً وہ اپنے استاد خلیل کی ایک روایت نقل کرتا ہے۔

”نرم الخلیل اندھ مجوزاں یقول المرجل: ہذا رجل اقونہ یلہ“

اذا سادت ان قشجندہ بأخی نریلہ۔ ۵۱

سیوریہ اپنے استاد خلیل کی اس رائے سے شد و مد کے ساتھ اختلاف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس تعبیر کے اندر ضعف اور قباحیت ہے۔ ایسا کرنا صرف حالت اضطراب ہی میں جائز ہو سکتا ہے۔

۵۔۔ اپنے قاریوں کے لیے وہ ایک مفسر اور شارح ثابت ہوتا ہے۔ جب کبھی کبھی مسائل ایک دوسرے سے ملتبس ہو جایا کرتے ہیں فردق و امتیازات آپس میں متضاد ہو جاتے ہیں تو قاری کو الجھ کر حیرت و استعجاب کا شکار ہو جانا پڑتا ہے لیکن وہ خود ہی مسائل کو ایک دوسرے سے واضح طور پر الگ الگ کرتا ہے اور اس طرح قاری کے اضطراب اور حیرت و تعجب کو مدق و بہارت کے ساتھ دفع کرتا ہے اور جوابات دے کر مطمئن کرتا ہے۔

الکتاب کی شروع و تعلیقات :

جیوں ہی یہ کتاب تہذیب و نظر ثانی کے بعد منظر عام پر آئی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کی مقبولیت کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ وقت کے چوڑے چوڑے علماء تحفے تقریباً تمام ہی لوگوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے الکتاب سے رشتہ جوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ الکتاب کی بیشمار شرحیں لکھی گئیں اور دبستان بعصرہ کا شاید ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جس نے الکتاب پر حواشی نہ لکھے ہوں یا اس کے مضامین میں اضافہ نہ کیا ہو۔ ذیل میں اس کتاب کے شارحین کی ایک فہرست دی جا رہی ہے۔

(۱) ابو سعید حسن بن عبد اللہ جو سیرانی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی شرح لکھی۔ انتقال ۳۶۸ھ میں ہوا۔

(۲) سیرانی کے صاحبزادے یوسف نے بھی شرح لکھی۔ اس کا انتقال ۳۸۵ھ میں ہوا۔

(۳) قیسری شریعت ابو جعفر احمد بن محمد النحاس النوری نے لکھی اور اس میں انھوں نے سیبویہ کی الکتاب کے نحوئی شواہد پر بھی بحث کی۔ انتقال ۳۳۸ھ میں ہوا۔

(۴) جو تھی شرح ابو العباس محمد بن یزید جو برد کے نام سے معروف ہیں، نے لکھی اور سیبویہ کے نحوئی شواہد پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ۲۸۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۵) احمد بن ابان اللغوی الاندلسی نے بھی اس کی ایک شرح لکھی ہے۔ انتقال ۲۸۵ھ میں ہوا۔

(۶) ابراہیم ابن سفیان الزیادی المتوفی ۲۲۹ھ کی شرح۔

(۷) علی ابن سلیمان کی شرح جو لا تحفش الا صغر سے معروف ہیں۔

(۸) ابن السراج (ابو بکر) محمد بن السری (ابن زادی) کی شرح۔ ان کا انتقال

۳۱۶ھ میں ہوا۔

(۹) ابو عمر عثمان بن عمر المالکی کی شرح۔ یہ ابی حاجب نخوی کے نام سے بھی جلتے جاتے ہیں۔ ان کی موت ۶۴۶ھ میں واقع ہوئی۔

(۱۰) علامہ جابر اللہ ابو قاسم محمود بن عمر الزمخشری کی شرح جن کا انتقال ۵۳۸ھ میں ہوا۔

علی نجدی تاصف نے بھی شارحین ”الکتاب“ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ علماء اندلس جنہوں نے اس کی شرح پر کام کیا ہے ان میں بلند پائے والے محدثین درجہ ذیل ہیں۔

(۱) ابو بکر محمد بن الحسن الزبیدی الاشبیلی المتوفی ۳۷۹ھ (۲) ابو نصر ہارون بن موسیٰ القرطبی المتوفی ۴۰۱ھ (۳) یوسف بن سلیمان الشنتمری جو الا علم کے نام سے معروف ہیں اور جن کا انتقال ۴۷۶ھ میں ہوا (۴) ابو الحسن علی بن احمد جو ابن ہاذخ القرطابی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وفات ۵۲۸ھ میں ہوئی۔ (۵) ابو بکر محمد بن مسعود الخشنی المتوفی ۵۴۴ھ (۶) محمد بن احمد ابن ہشام اللخمی السیسی المتوفی ۵۵۷ھ۔ (۷) ابو الحسن علی بن محمد جو ابن حزمہ کے نام سے معروف ہیں۔ ۶۰۶ھ میں انتقال ہوا۔

مشرقی ممالک میں جنہوں نے الکتاب کی شرح لکھی چند نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ابو عثمان بکر بن محمد المازنی المتوفی ۲۴۸ھ (۲) ابو اسحاق ابراہیم السری لزجاج۔ متوفی ۳۱۱ھ (۳) ابو علی الحسن بن احمد الفارسی المتوفی ۳۷۷ھ (۴) ابو الحسن علی بن سبئی الرمانی المتوفی ۳۸۴ھ

مصری علماء جنہوں نے شرح لکھی یا کچھ اضافہ کیا۔

(۱) ابو عبد اللہ الغنی سلیمان بن نبین الدیقی المتوفی ۶۱۳ھ (۲) ابن الحاجب عثمان

بن علی المتوفی ۶۴۶ھ

ان شرقیوں کے علاوہ کچھ تعلیقات بھی ہیں جو علماء اندلس اور مشرق کی ہیں
(۱) ابوالحسن سلیمان بن محمد الاشجیلی جو ابن الضائع سے جانے جاتے ہیں۔
۶۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

(۲) سلیمان بن محمد المالقی جو ابن الطرارة سے معروف ہیں اور جن کا انتقال
۵۲۸ھ میں ہوا۔

مشرق میں ابو محمد عبید اللہ بن محمد بن ابی بردۃ نے بھی تقریظ لکھی نیز مصر کے
احمد بن محمد بن ولاد نے بھی ”الکتاب“ کی تقریظ لکھی ہے۔ ۳۳۲ھ میں انتقال کر گئے۔
تحریر و اختصار کی بھی کچھ لوگوں نے ذمہ داری انجام دی ہے۔ اس سلسلے میں ابوجہلی
محمد بن یوسف کا نام آتا ہے جو اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کا انتقال ۴۷۵ھ
میں ہوا۔ اور ابراہیم بن محمد البعینی نے اس کتاب کے احکام کو موزن و مختصر بنا کر
پیش کیا ہے۔

جن لوگوں نے اسے یاد کر لیا اور اس میں تخصّص کیا وہ علماء غرب اور علماء مشرق
دونوں ہیں۔

علماء غرب میں ابوالقاسم ابراہیم بن عثمان القروانی المتوفی ۳۴۶ھ۔
ابوالقاسم حلف بن یوسف الاندلسی الشترینی المتوفی ۵۳۲ھ، ابو عامر بن
عبید اللہ بن یحییٰ الاشجیلی المتوفی ۵۶۰ھ، محمد بن حجاج الاشجیلی جو ابن المطرفی کے
نام سے مشہور ہیں) المتوفی ۷۰۶ھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور علماء مشرق میں ابوبکر
عبید اللہ الحنطاط الاصبہانی اور ابراہیم بن مسعود المتوفی ۵۹۰ھ کے نام ملے ہیں۔
سیبویہ کی ”الکتاب“ سے متعلق لکھی گئی مندرجہ بالا تمام شرحیں، تقریظات
اور تجریدات اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ وقت کے مشہور ترین علماء اور

ادبار کا کسی نہ کسی جہت سے اس کتاب سے تعلق قائم رہا ہے۔ بلکہ اگر شرح و تعلیقات کے اس ذخیرہ کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ طبقہ علماء نے اس کتاب سے کسی طرح کا بھی تعلق قائم رکھنا باعث شرف و افتخار سمجھا اور نحوی معاملات میں مرجع کا مقام دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر خدیجہ الحدیثی نے اپنی کتاب کتاب سیبویہ و شروحه (صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۵) میں ذکر کیا ہے: ”کتاب سیبویہ کے گیارہ قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی دو درجن نے زائد شرح لکھی گئیں، دو درجن تعلیقات و حواشی اور پانچ استاد راکات تصنیف کیے گئے۔“

علماء اور ادبار کے تاثرات قلبی

اگرچہ اس کتاب کی خصوصیات، اس میں سیبویہ کی شخصیت کی جھلکیاں اور اس کی شروح و تعلیقات کی روشنی میں اس کے مقام کی تعیین کرنا مشکل نہیں ہے۔ تاہم اس حقیقت کے اعتراف سے راہ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی کہ اس کتاب سے متعلق ممتاز ترین علماء اور ادبار کے خیالات بھی اس کی اعلیٰ و ارفع پوزیشن کو تسلیم کرانے میں قابل ذکر محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہذا چند علماء و ادبار کے تاثرات قلبی کا اظہار کیا جانا مناسب ہے۔

سب سے پہلے امام جاحظ کی ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس سے ایک طرف تو جاحظ کی نظر میں جو اس کی قدر و منزلت ہے وہ سامنے آتی ہے اور دوسری طرف محمد بن عبد الملک کا تاثر یہ بتاتا ہے کہ فی الحقیقت یہ ایک بیس قیمت سرمایہ ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک بار محمد بن عبد الملک کے یہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر ہدیہ میں پیش کرنے کے لیے جو سب سے قیمتی چیز ملی وہ سیبویہ کی کتاب تھی تو میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسی چیز ہدیہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے مقابلے میں

اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اور وہ ہے ایک کتاب جسے خزانہ کی میراث میں سے خریدی ہے۔ تو اس پر محمد بن عبد الملک نے کہا ”مجھے اس سے زیادہ قیمتی چیز یہ نہیں کی گئی۔“

کوئی شخص جو اس کتاب کے پڑھنے کا مشتاق ہوتا اور ہر روز کی طرف رجوع کرتا تو وہ اس سے پوچھتا ”کیا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے؟ یعنی یہ کتاب سمندر کی طرح وسیع پر چل اور مشکل ہے۔“

ابوسعید الحسن بن عبد اللہ کہتے ہیں ”وَعَمَلُ كِتَابِهِ الَّذِي لَمْ يَسْبِقْهُ
أَنَّى قَتْلَهُ أَوْ حُلُّ قَبْلَهُ وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِ مِنْ بَعْدِهِ“^{۲۲}
امام زحمری نے سیبویہ اور اس کی کتاب کی اہمیت یوں ذہن نشین کرائی

الاصطیٰ الالہ صلاۃ صدق۔ علی عمر و بن عثمان بن قنبر
قان کتابہ لم یغن عنہ۔ بنو قلم و انباغ منبر۔^{۲۳}

ابن خلکان کی دیفات میں ہے کہ سیبویہ کی کتاب اس کی شہرت و فضیلت کی وجہ سے علم کے طور پر جانی گئی۔ بصرہ میں جب بھی کہا جاتا کہ فلا نے الکتاب پڑھی تو بیں جان لیا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب کی قرأت کی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔^{۲۴}
میرستہ ابن ندیم میں المازنی کا قول ہے ”من اما اداں یعمل کتابا کبیرا فی انھو بعد کتاب سیبویہ، فلیستحی۔“^{۲۵}

مہم الادباء میں صاعد بن احمد اسی کتاب کی تعریف کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اندس کا اپنی کتاب میں ذکر کیا۔ مجھے کسی ایسی کتاب کا علم نہیں (خواہ قدیم علوم میں ہو یا جدید میں) جو تمام ہی علوم پر مشتمل ہو اور اس فن کے اجزاء کا پورے طور پر احاطہ کیا گیا ہو

مئی ۱۹۸۸ء

۳۱۷

لیکن یہی کتابیں ضرور ہیں جو ان اوصاف کی حامل ہیں۔ علم ہیئت کے سلسلے میں (۱) بطلمیوس کی کتاب المجسطی۔ (۲) علم منطق میں ارسطو کی کتاب (۳) اور نحو میں سیبویہ کی کتاب۔

جناب کلنٹ ہارٹ اس کتاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

THIS KITAB WAS FAMOUS ALL OVER THE EAST
AND HAS REMAINED THE GREAT AND FAVOURITE
AUTHORITY. NO OTHER WORK HAS BEEN
ACKNOWLEDGED ITS EQUAL 4 26

یہ کتاب پورے مشرق میں مشہور و معروف تھی۔ اور عظیم المرتبت اور منظور نظر سند کی حیثیت سے برقرار رہی۔ اس کے ہم پلہ کبھی بھی دوسرے کام کو نہیں جانا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی زبان میں کلنٹ بھی اس کا اعتراف ابو بکر الزبیدی نے بھی اپنی کتاب میں ”وکان فی لسانہ جستہ“ کے الفاظ سے کیا ہے۔ چنانچہ اس کے زبان کی اس معذرتی کے پیش نظر اگر اس کے قلم کی تعریف کی جائے اور فصاحت و بلاغت سے پر اس کی شاہکار تصنیف کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف سے راہ گریز اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ الکتاب کا ایک ایک صفحہ نوحی فکر و نظر کی گہرائی و گہرائی کے ساتھ ساتھ اس کے زور بیان اور دلکش انداز تحریر کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اسی زور قلم کا ثمرہ ہے کہ وہ ادل شخص ہے جس نے علم نحو کو پھیلا کر بیان کیا اور اس سے متعلق باریکیوں اور زراکتوں کی شرح و بسط کے ساتھ عقدہ کشائی کی خدمت انجام دی۔ اللہ

علی انہدی ناصف جنہوں نے سیبویہ پر امام اسحاق کی حینیت سے ریسرچ کیا ہے

اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اور وہ ہے ایک کتاب جسے قراء کی میراث میں سے خریدی ہے۔ تو اس پر محمد بن عبد الملک نے کہا ”مجھے اس سے زیادہ قیمتی چیز یہ نہیں کی گئی۔“

کوئی شخص جو اس کتاب کے پڑھنے کا مشتاق ہوتا اور مرد کی طرف رجوع کرتا تو وہ اس سے پوچھتا ”کیا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے؟ یعنی یہ کتاب سمندر کی طرح وسیع پر حول اور مشکل ہے۔“

ابو سعید الحسن بن عبد اللہ کہتے ہیں ”وَعَمَلُ كِتَابِهِ الَّذِي لَمْ يَسْبِقْهُ
إِلَّا قِتْلُهُ أَوْ هَلْ قَبْلَهُ دَلِمٌ يُلْحَقُ بِهِ مِنْ بَعْدِهِ“ ۲۲
امام زحشری نے سیبویہ اور اس کی کتاب کی اہمیت یوں ذہن نشین
کرائی

الاصليّ الا لہ صلاۃ صدق - علی عمر و بن عثمان بن قنبر
فان کتابہ لم یغن عنہ - بنو قلم ولا اتباع منبر۔ ۲۳

ابن خلکان کی دنیات میں ہے کہ سیبویہ کی کتاب اس کی شہرت بفضلت کی وجہ سے علم کے طور پر جانی گئی۔ بصرہ میں جب بھی کہا جاتا کہ فلا نے الکتاب پڑھی تو بیں جان لیا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب کی قرأت کی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔ ۲۴

نیرستہ ابن ندیم میں المازنی کا قول ہے ”من اراد ان یعمل کتابا
کبیراً فی النحر بعد کتاب سیبویہ، فلیستحی۔“ ۲۵

معم الادب میں صاعد بن احمد لکھتا ہے کہ انھوں نے اہل اندلس کا
اپنی کتاب میں ذکر کیا۔ مجھے کسی ایسی کتاب کا علم نہیں (خواہ قدیم علوم میں ہو یا جدید
ہو) جو تمام ہی علوم پر مشتمل ہو اور اس فن کے اجزاء کا پورے طور پر احاطہ کیا گیا ہو

مئی ۱۹۸۸ء

۳۱۴

لیکن میں اسی کتاب میں ضرور ہیں جو ان اوصاف کی حامل ہیں۔ علم ہیئت کے سلسلے میں (۱) بطلمیوس کی کتاب المجسطی۔ (۲) علم منطق میں ارسطو کی کتاب (۳) اور نحو میں سیبویہ کی کتاب۔

جواب لکھنٹ ہارٹ اس کتاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

THIS KITAB WAS FAMOUS ALL OVER THE EAST
AND HAS REMAINED THE GREAT AND FAVOURITE
AUTHORITY. NO OTHER WORK HAS BEEN
ACKNOWLEDGED ITS EQUAL 4 26

یہ کتاب پورے مشرق میں مشہور و معروف تھی۔ اور عظیم المرتبت اور منظور نظر سند کی حیثیت سے برقرار رہی۔ اس کے ہم پلہ کبھی بھی دوسرے کام کو نہیں جانا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی زبان میں لکھنٹ بھی اس کا اعتراف ابو جبر الزبیدی نے بھی اپنی کتاب میں ”وکان فی لسانہ جستہ“ کے الفاظ سے کیا ہے۔ مثلاً چنانچہ اس کے زبان کی اس معذرتی کے پیش نظر اگر اس کے قلم کی تعریف کی جائے اور فصاحت و بلاغت سے پر اس کی شاہکار تصنیف کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف سے راہ گریز اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ الکتاب کا ایک ایک صفحہ نحوی فکر و نظر کی گیرائی و گہرائی کے ساتھ ساتھ اس کے زور بیان اور دلکش انداز تحریر کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اسی زور قلم کا ثمرہ ہے کہ وہ ادل شخص ہے جس نے علم نحو کو پھیل کر بیان کیا اور اس سے متعلق باریکیوں اور زراکتوں کی شرح و بسط کے ساتھ عقدہ کشائی کی خدمت انجام دی۔ مثلاً

علی ہندی ناصف جہوں نے سیبویہ پر امام اسحاق کی حینیت سے ریسرچ کیا ہے